JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 40, Issue No.01

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 300 9561745

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
khawarnawazish@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu,
Bahauddin Zakariya University, Multan

TITLE OF THE PAPER

۴۷ء کے بعد کا افسانہ اور شناخت کے مسائل

AUTHOR(S)

* **Ijaz Ahmad Wattoo**
PhD Scholar, Department of Urdu
The Islamia University, Bahawalpur

** **Dr. Sajjad Naeem**
Assistant Professor, Department of Urdu
Emerson University, Multan

CONTACT

** sajjadnaeemmultan@gmail.com

HISTORY OF THE PAPER

Received on: February 27, 2024
Accepted on: June 25, 2024
Published on: June 30, 2024

DETAIL(S)

Volume No. 40, Issue No. 01, Page No: 55-80
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2024. ©Journal of Research (Urdu) 2024.
This publication is an open access article.

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

* اعجاز احمد وٹو ** ڈاکٹر سجاد نعیم

۴۷ء کے بعد کا افسانہ اور شناخت کے مسائل

Post-47 Short Story and Identity Probelms

ABSTRACT

In this article all kinds of cultural, civilizational and personal identity crises has been discussed that arose after the establishment of Pakistan in 1947. Along with this, the internal crises caused by Martial Laws that affected the individuals and then the serious damage caused by the incident of 9/11 to the Muslim Identity, has been focused for a details analytical study in the light of Urdu Short stories.

KEYWORDS

Cultural, Civilization, Personal Identity, Martial Law, 9\11 ,Muslim Identity

قیام پاکستان کے دوران گروہ وارانہ فسادات اردو افسانے کا ایک اہم موڑ ثابت ہوئے۔اس دوران اور بعد میں اردو افسانہ جن حالات سے دو چار ہوا،وہ ہجرت و فسادات ،مہاجرین کی آمد اور ان کی آباد کاری،نئے نظامِ جمہوریہ کا قیام،معاشی وسیاسی اور تہذیبی مسائل کا جمگھٹا تھا۔جو افسانے کے اسٹیج پر چھایا رہا۔(1)فسادات نے موضوعاتی جہت کو یکسر پلٹ دیا۔اب فرد کی تنہائی،اجتمائی تہذیبی بکھراؤ،انسانی وحشت و بربریت اور ہجر کے المیے کو اہمیت ملی،،اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی رجحان بنتا گیا۔(2)اس سانحے سے ایک عجیب طرح کی بے بسی،مایوسی و محرومی،بیگانگی اور شناختی زوال کے احساس نے جنم لیا،جسے کہانی کاروں نے کرداروں کی صورت میں بیان کیا۔اس طرح کی کہانیوں سے عیاں ہے کہ ایک انسان ہے جو ہر لمحہ منظر سے دور ہٹ رہا ہے۔"انسان پہلے وحشی بنا اور پھر پوری بساط پر چھا گیا اور اصل آدمی رفتہ رفتہ گم ہو گیا۔"(3)شکست و ریخت کے اس عمل میں فرد،تنہائی اور بیگانگی کے زیر اثر شناخت کے بحران کا شکار ہو گیا۔اسے نئے وطن میں مکمل پناہ ملی نہ پہچان نصیب ہوئی۔اسے اپنے ملک میں ہی بے وطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔وہ محض تہذیبی وثقافتی بیگانگی کا شکار نہیں ہوا بلکہ اسے فکروذہنی جلاوطنی کا کرب بھی ملا۔اس کے احساسات وجذبات بھی منقسم نظر آئے۔کل تک جس خاک کو آنکھوں سے لگایا جاتا تھا اس

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

اُس پر دشمن قابض ہو گئے تھے۔اور اس سے تمام رشتے ناطے ختم ہو چکے تھے۔(4)دو متضاد تہذیبی وفاداریوں کے فیصلہ کن مرحلے پر کھڑا اسر نیہوڑا ہے حیران و ششدر رہے کہ اس کی منزل کہاں اور کس طرف ہے؟ وہ کہاں بھٹک گیا ہے؟اس عہد کے افسانہ نگاروں نے اس بیگانگی میں گھرے تنہا، نڈھال اور گمشدہ فرد کی بازیافت کی کاوش کی ہے۔اور ہر حوالے سے اس کی شناخت کے بحران کو واضح کیا ہے تاکہ اس کی دو نیم فردیت کو پھر سے اکٹھا کیا جاسکے۔

دراصل جس مقصد کے لیے ریاستِ خداداد کا قیام عمل میں لایا گیا تھا وہ قطعاً پورا نہیں ہوا۔ کہنا چاہیے کہ جاگیر دارانہ نظام فوج اور بیوروکریسی نے پورا ہونے ہی نہیں دیا۔ کوئی بھی سیاسی نظام اس ریاست کی شناخت بن نہیں پایا۔نئے ملک، نئے نظام اور نئے کلچر کو ترتیب دینے والے وہ لوگ تھے جنھیں وقت کی ایک بڑی لہر نے اپنی سطح سے اچھال دیا تھااور وہ ایک دم عصر حاضر کے روح رواں بن بیٹھے۔75 سالوں کے بعد بھی پاکستان اور اسکے عوام کو شناختی محرومی کا سامنا ہے۔ہماری ریاست یہ فیصلہ کرنے میں ناکام رہی ہے کہ آخر پاکستان کی تاریخ شروع کہاں سے ہوتی ہے اور اسکی تہذیبی جڑیں ہیں کہاں؟۔بس پہلے دن سے ہی مرضی کی شناخت کو تھوپا گیااور ثانوی شناختوں کو نظر انداز کیا گیا، جس سے مسائل اور شناختی بحران میں اضافہ ہی ہوا۔

اس ہجرت کے موضوع پر کرشن چندر کا افسانہ مجموعہ 'ہم وحشی ہیں' بیدی کا 'لاجونتی'، منٹو کے 'کھول دو' اور 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، عصمت کا 'جڑیں'، حیات اللہ انصاری کے 'شکر گزار آنکھیں'، 'ماں اور بیٹا'، عزیز احمد کا 'کالی رات'، شہاب کا 'یاخدا' اور 'عائشہ آگئی'، قاسمی کا 'پرمیشر سنگھ'، خدیجہ مستور کا 'مینوں لے چلے بابلا'، انتظار حسین کے 'ایک بن لکھی رزمیہ'، 'اجودھیا' اور اشفاق احمد کا 'گڈریا' موضوعاتی اور فنی لحاظ سے بہترین تخلیقات ہیں۔

انتظار حسین کے افسانے 'قیوما کی دکان'، 'اجودھیا'، 'نجّا کی آپ بیتی' اور 'استاد' جیسی تخلیقات میں انسان اور جگہ کی روحانی جُڑت اور پھر جدائی کے بعد کے اندرونی کرب کی کہانیاں بیان ہوئی ہیں۔یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ فرد اپنی فردیت، ذات، تہذیب اور شناخت کی تلاش میں بھٹکا پھرتا ہے۔اور جب وہ اپنی تلاش کے پیچھے قومی و تہذیبی ورثوں کی کھوج میں بھاگتا ہے تو وجود کی حرارت سے لو دیتی ہے، یوں دیس سے دور ہجرت کا جبر سہنے والوں کے ذہنی رویوں کی بازیافت ہوتی ہے۔(5)

دراصل بدلی ہوئی قدریں اور تہذیبی الٹ پلٹ کے زیر اثر انتظار حسین کے کردار نئی فضا سے سمجھوتا نہیں کر سکے اور وہ ذات کے اندر سمٹ کر ہر قسم کی شناخت کے خسارے کا شکار بن گئے "ہم کسی گزرے قافلے کی بھٹکی ہوئی پرچھائیاں ہیں"(6)'اجودھیا'آزادی کے بعد کے ماحول کا مرثیہ ہے کہ جہاں نفسا نفسی، موقع پرستی، جھوٹ، حیوانیت، منافقت، تنہائی اور لایعنیت کا ویرانہ ہے۔۔بقول فردوس انور قاضی:

> "کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ ماضی کی یاد سے نڈھال، حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس آدمی کی ذہنی کیفیت افسانے 'اجودھیا' میں مجسم ہے۔"(7)

'ایک بن لکھی رزمیہ' میں بھی ایسے ہی مایوس کن حالات اور عدم شناخت کے احساس کے تحت بدلتے ذہنی رجحان کو دکھایا گیا ہے۔

منٹو کے مجموعہ 'یزید' کی چار کہانیاں، یزید، ٹیٹوال کا کتا، آر ہی سلیوٹ اور گورمکھی سنگھ کی وصیت، شکست و ریخت، بدلتے ہوئے حالات، مذہبی منافرت اور اور عقائد و تصورات پر مبنی تلخ حقائق کی آئینہ دار ہیں۔(8)اس کے علاوا، ٹوبہ ٹیک سنگھ، بھی اہم نمائندہ کہانی ہے جس میں قیدی اچانک شناخت سے محروم ہو جاتے ہیں، ایک گومگو کی کیفیت ہے جو اُن کی سمجھ سے باہر ہے۔ کہ ہماری قانونی حیثیت کیونکر بدل گئی؟ سب مجسم سوال ہیں۔ بشن سنگھ کو اپنی دھرتی سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ اس سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا:

> "کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے گا، یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے گا اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کس دن سرے سے غائب ہو جائیں۔"(9)

افسانہ 'کھول دو' کی کردار پر اتنا جنسی تشدد ہوا ہے کہ 'کھول دو' کے الفاظ اس کی زخمی نفسیات میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ گویا اس کی شناخت بن چکے ہیں۔ اور وہ عصمت و عزت کے احساس سے عاری ہو چکی ہے۔ افسانہ، خدا کی قسم، میں بدلتی قدریں اور تہذیبی و ابدی شناختی خسارے نے اس طرح کی بے یقینی کو جنم دیا کہ اعتماد و یقین کی اس شکست کے بعد اگلا سفر موت کا ہے۔

'لاجونتی'اُن مجبور و بے بس عورتوں کی فہرست میں نہیں ہے جنھیں ان کے اپنے ہی پہچاننے سے گریزاں رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی غیرت و پاکیزگی جھوٹی عورتوں کو ٹھہرانے کی مجاز نہیں ہوتی۔ ایسی عورتیں سماجی اور معاشرتی طور پر عدم تشخص کے پھندے میں ڈولتی رہ جاتی ہیں،، انھیں زندگی قبول کرتی ہے نہ موت۔(10)'یا خدا' کی دلشاد اپنے وطن آکر بھی شناخت سے محروم رہی، غیروں نے غیر سمجھ کر اور اپنوں نے بے سہارا سمجھ کر لوٹا، تشخص کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ بقول ڈاکٹر ظفر سید:

"ہندوستانی اور پاکستانی جنھوں نے مذہبی و قومی وقار و تشخص کے سوال پر سرحدیں الگ کرلیں دراصل انسانی تشخص سے عاری ہو گئے۔"(11)

اس سانحے میں بڑا المیہ یہ رہا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی شناخت کو قائم کرنے کے لیے قتل و غارت کی، اِدھر مسلمانوں نے اپنے تشخص کا اعلان اسی ردِ عمل سے کیا جس کے نتیجے میں بہت بڑا جانی نقصان ہوا۔ جس کی مثال قوموں کی تاریخ میں نہیں ملتی،، اعلیٰ درجے کے انسان، اعلیٰ درجے کے معیار اور اقدار، یہ سب کہاں گئے۔(12)

خواجہ احمد عباس کا 'میں کون ہوں' کا کردار اُس جذباتی گروہ وارانہ فضا میں مرتے مرتے اپنی شناخت یوں کراتا ہے "میں ہندو نہیں ہوں، میں مسلماں نہیں ہوں، میں انسان ہوں"۔ حیات اللہ انصاری کا 'شکر گزار آنکھیں' منفرد افسانہ ہے۔ ایک آدمی ذات کی دو پرتیں رکھتا ہوتا ہے۔ ایک متعصب ہندو کی شناخت اور دوسری انسان ہونے کی شناخت۔ شکر گزار آنکھیں اس کا اس طرح تعاقب کرتی ہیں کہ بے بس ہو کر اُسے اپنی پہلی شناخت کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ یہ احساس گناہ کی عمدہ عکاسی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فرد کی فردیت کس طرح خارج سے متاثر ہوتی ہے(13) اسی طرح کی ملی جلی کیفیت 'ٹھنڈا گوشت' کے ایشور سنگھ کی بھی ہے، جو اندھی ہوس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنی مردانگی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ عزیز احمد کا 'کالی رات' میں یہ تاثر ملتا ہے کہ ہندو، مسلم اتحاد اور تہذیبی وحدت کی تمام کاوشیں اپنے آپ کو فریب دینے کے مساوی تھیں۔ جو فاصلے تاریخی قوتوں نے پیدا کر دیئے تھے انھیں مٹانا ممکن نہیں تھا۔ اس آگاہی کے باوجود جب عزیز احمد خون کی ندیاں بہتی دیکھتے ہیں تو وہ اس کا ذمہ دار لیڈروں کو قرار دیتے ہیں(14)"یہ ساری آگ ہمارے لیڈروں نے لگائی ہے"(کالی رات)۔

احمد ندیم قاسمی کا مجموعہ 'آس پاس' کے تمام افسانے ہجرت کے بعد جنم لینے والی افسردگی بے تعلقہ ،تنہائی،اور شناختی محرومی کا شکار ہیں، جیسے کہ افسانہ 'اکیلی' کی 'خانی' تنہائی کے مستقل وجود سے دوچار ہے۔اور، بھری دنیا میں، بھی یہی تاثر ہے کہ انسان بے بس اور اکیلے پن کے شدید احساس سے متاثر ہے:

"بنجر میدانوں اور ویران پہاڑیوں پر بکھری ہوئی بے شمار انسانی لاشوں کے تعفن نے مشرقی افق کو دھندلا دیا ہے۔"(15)

قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے منقسم ہندوستان کے حالات کو سب سے زیادہ اپنی شخصیت کا حصہ بنایا۔ان کے افسانوں میں تاریخ اور تہذیب سے کٹ جانے کا احساس، تنہائی، اداسی اور محرومی کا وہ باطنی کرب ہے جو رفتہ رفتہ موت کا سبب بنتا ہے،،قرۃ العین کے ہاں ہجرت المیہ بنتی ہے مگر انتظار حسین کے ہاں ہجرت روحانی المیے کے طور پر سامنے آتی ہے۔(16)قرہ العین حیدر کے افسانے 'ہاؤسنگ سوسائٹی' اور 'کیکٹس لینڈ' ماضی کی گمشدگی کا استعارہ ہیں۔اس کے کردار بنیاد سے اکھڑ کر لامحدود راستوں میں بھٹک جاتے ہیں۔اپنے وجود،شناخت اور تکمیل کے لیے اپنی بنیاد کی طرف لپکتے ہیں جو ماضی میں کہیں گم ہو گئی ہے۔

بہر حال وجودِ پاکستان کو لاحق، تہذیبی و ثقافتی بیگانگی، بے یقینی، مٹتی ہوئی فردیت، قومی تشخص و انا،اجتماعی ہجرت و بے گھری اور انسانی وحشت و بربریت ایسے مسائل تھے کہ جن کو اُس عہد کے قریباہر افسانہ نگار نے موضوعِ قلم بنایا۔ڈاکٹر محمد عالم خاں یوں لکھتے ہیں:

"ان افسانہ نگاروں میں ایک نوحے کی بازگشت ہے جو تہذیبوں کے بکھر جانے اور فرد کے لٹ جانے کے المیے سے جنم لیتی ہے۔ان میں بعض افسانہ نگاروں کے ہاں ایک نہ ختم ہونے والے روگ اور افسردگی کی گہری شدت پائی جاتی ہے۔"(17)

سقوطِ ڈھاکہ اور شناخت کا المیہ:

مشرقی پاکستان کے المیے نے ہجرت کے موضوع کو پھر سے تازہ دم کر دیا۔جو 47ءمیں مشرقی پاکستان سدھارے تھے انھیں مکرر ہجرت کا خونی دریا پار کر کے مغربی پاکستان آنا پڑا گیا۔یہاں پہلے مہاجروں کے حالات دگرگوں تھے بالخصوص سندھ، کراچی، میں جہاں اب بھی وہ مہاجر ہی کی شناخت کے ساتھ رہ رہے تھے۔نسل اور

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

لسانی تعصب زخموں پر نمک کا کام کرتا رہا۔اس صورتحال کے اوپر 71ء کے مہاجر بھی آ گئے۔ان ہجرتوں کے مہاجرین تیسری نسلوں تک مہاجر ہونے کی شناخت کرواتے رہے۔کراچی میں اب بھی ایسے جراثیم باقی ہیں۔البتہ پنجاب نے مہاجرین کو اپنی شناخت میں سمو لیا۔

اس عہد کے نمائندوں میں رشید امجد، منشایاد، احمد داؤد، مشتاق قمر، اعجاز راہی، سمیع آہوجہ، مظہر الاسلام، احمد جاوید اور مرزا حامد بیگ اہم ہیں۔انھوں نے سیاسی معاشرتی پابندیوں کے خلاف مزاحمتی رویوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔اور فرد کے معدوم ہوتے وجود اور اس کی شناخت کے کھو جانے کے اندرونی کرب کو پیش کیا۔اس کرب میں آمروں کی آمریت نے مزید اضافہ کیا۔اور جنھوں نے براہ راست اس المیے کو پیش کیا ان میں احمد زین الدین، شہزاد منظر، علی حیدر ملک، مسعود اشعر، ام عمارہ انتظار حسین، فرخندہ لودھی، غلام محمد، الطاف فاطمہ اور محمود واجد قابل ذکر ہیں۔اعجاز راہی کا افسانہ 'تیسری ہجرت' بے زمینی کے دکھ میں گندھا شدید کرب کا اظہار یہ ہے۔ایک ایک فرد اس آسیب کا شکار دکھائی دیتا ہے،،لوگوں نے آواز سنی اور اسے حقیقت کی آواز قرار دیا اور اپنے ہنستے بستے گھروں کو چھوڑ کر نئے شیروں کی طرف روانہ ہوئے، جب وہ نئے شہروں میں داخل ہوئے تو ان کے استقبال کو کوئی نہیں آیا۔(18)

فرخندہ لودھی کے ہاں بھی اس ہجرت کا جبر پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔افسانہ 'بوٹیاں' میں اپنے خاندان سے بچھڑی لڑکی،، منی،، کے پس منظر میں مملکتِ خداداد کو لٹتے دکھایا گیا ہے۔اور ،شباب گھر کے راستے پر، میں اپنی مٹی سے بچھڑنے کا بے پناہ احساس مہاجرین کے کرب و بلا میں اضافے کا باعث بنتا ہے،، وہ لوگ جنھیں بقائمی ہوش و حواس مشرقی پنجاب کے پھرے پرے شہروں سے ہجرت کرنا پڑی۔ان کے ماضی کباڑ خانے جن پر بعض نے تالے ڈال دیئے اور بعض ایک ایک چیز، ایک ایک واقعے کو دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں۔(19)

غلام محمد قاصر نے اس المیے کو نہ صرف بہ نفسِ نفیس جھیلا بلکہ اس جنونیت اور نامعقولیت کو اُسی شدت کے ساتھ احاطہ تحریر میں لائے بھی۔یہ اردو بولنے والے تھے جس کی بناپر انھیں خوار کر کے سلاٹر ہاؤس لے جایا گیا۔لیکن بنگالی بیوی کی مداخلت سے بچ گئے۔(20)ان کے بیشتر کردار مسلسل ایک شکست و ریخت ،ٹوٹ پھوٹ اور عدم جسمیت کی جبریت سے دوچار نظر آتے ہیں۔جو اُس عہد کی پروردہ ہے۔ان کی کئی کہانیوں کا اختتام، ایک سہا ہوا شخص، کی علامت ہیں۔'چاند کو چلے پاگل' میں لکھتے ہیں:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

"جنگیں لڑی جاتی ہیں کیونکہ بعض حکومتیں ایسا چاہتی ہیں اور بعض مجبور ہو جاتی ہیں مگر لوگ تباہی ہو جاتے ہیں۔"(21)

افسانہ 'تین مسافر' میں ایک ٹرین ہے جو بیس برس سے رواں دواں ہے لیکن اسٹیشن ندارد ہے۔ کچھ مسافر اچانک ہر شے پر قبضہ کر کے ٹرین کو مرضی سے چلاتے ہیں اور بقیہ مسافر مجبور و محکوم دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل یہ ٹرین پاکستان کے بائیس برسوں کی لوٹ کھسوٹ اور اداروں کی برتری کی کہانی ہے۔ جو پاکستان کی شناخت کو بھی چٹ کر گئے۔ 'پُراسرار بندے' میں بے راہ روی، بے منزل مسافرت، بے سمتی، بے یقینی اور تہذیبی عدم تشخص کی عکاسی کی گئی ہے:

"اب لوگ عریاں ہو چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کپڑے ان کے جسموں سے اچانک اتر گئے، شرم و حیا گئی اور اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا۔"(22)

بشیر منصور لکھتے ہیں:

"غلام محمد اپنے افسانوں میں خوف کی زد میں ہوئے ان لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں جن کی زبان بنگالیوں سے مختلف تھی۔ اور اس وجہ سے وہ بنگالیوں کے زیر عتاب آئے۔"(23)

بہر حال ان کے افسانے سیاسی الٹ پھیر، تاریخ کی فاش غلطیاں اور اخلاقی و تہذیبی زوال کا کھلا اور مکمل اظہار یہ ہیں۔ بنگال کی تاریخ اور ملکی حوالے جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ کرشنا، شجر ممنوعہ، منزل اپنی اپنی، تیسری آنکھ والا، آکائی، ناگ پھریں متوالے، وغیرہ میں موجود ہیں۔

احمد سعدی بھی بنگلہ دیش کے اہم افسانہ نگار ہیں ان کا افسانہ،، تیسرا دن،، علامت کے پس منظر میں اپنوں کی بے قدری، بےاعتباری اور عدم شناخت سے دوچار ہے۔ برسوں اکٹھے رہنے والے اسے عزت اور شناخت دینے آج اس سے اغماض کا رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ افسانہ، مٹی کی خوشبو، کا کردار لٹی پٹی لڑکی مزاحمت پر مجبور کر دی گئی ہے اور اپنے تشخص کے لیے مسلح ہو گئی ہے:

"دروازے کے بیچوں بیچ وہ لڑکی رائفل تانے کھڑی ہے۔"(24)

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

شہزاد منظر کا مجموعہ 'ندیا کہاں ہے تیرا دیس' کا دوسرا حصہ مشرقی پاکستان کے المیے پر مشتمل افسانوں کے کرداروں کو تہری ہجرت و تفرقے کا سامنا ہے۔ہندوستان سے لٹے پٹے مشرقی پاکستان پہنچے پھر مغربی پاکستان پہنچے تو انھوں نے بوجھ سمجھ کر شناخت دینے سے انکار کر دیا۔اور آخر کار تیسرے وطن کی جانب ہجرت کرنا پڑی۔ یہ کردار اردو بولنے والے ہیں مگر بنگالی کلچر میں پوری طرح رچ بس چکے ہیں۔بنگالی لڑکیوں سے شادیاں بھی کر لیں۔ لیکن آخر کر انھیں پہچان کر اجداد کی شناخت کا پھندہ ان کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے۔یہی آبائی شناخت موت اور جلا وطنی کا پروانہ ثابت ہوئی۔یعنی جس زمین کے مظالم سے بچنے کو پناہ لی، وہی پناہ گاہ، مقتل گاہ بن گئی۔ کیونکہ اُن کی شناخت آخر وہی ٹھہری جہاں کا خمیر تھا۔(25)افسانہ 'تیسرا وطن' کا بہاری کردار پاکستان آتے ہوئے اپنی محبوبہ سے یوں مخاطب ہے:

> " ہم سب تاریخی جبریت کا شکار ہیں۔ پاگل ہمیں تو اس پر ہنسنا چاہیے اُن حالات پر ہنسنا چاہیے جن کے تحت یہ ملک بنا، جن کے تحت ہم نے وطن چھوڑا،اور اس خطہ ارض کو اپنا وطن سمجھا،اس سر زمین سے محبت کی،اس کی زبان و تہذیب کو اپنایا اور پھر بھی اس سر زمین نے انھیں قبول نہ کیا۔"(26)

'اب ہم کہاں جائیں گے ماں' میں بے وطنی کے ملال و کلال کو دردناک انداز میں بیان کی گیا ہے۔اس عہد میں چہار سو نسل و قومیت زبان، علاقائیت کی پُر تشدد انہ کارروائیاں نظر آتی ہیں۔ جس کا شکار غریب الوطن بھی ہو جاتے ہیں۔اور بے بسی سے پوچھتے ہیں کہ "اب ہم کہاں جائیں گے ماں،، کیونکہ اپنوں نے ہی شناخت دینے اور پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ کراچی والوں نے بھی وہی سلوک کیا جو ڈھاکا میں ہوا،، فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرد کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔اور مارنے پیٹنے کے بعد انھیں گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا"،اس موضوع پر شہزاد منظر کی کہانیوں کے سبھی کردار یکساں بے سمتی، بے شناختی اور بے توقیری کے شدید احساس کا شکار ہیں۔ نیا دیس انھیں قبولیت بخشتا ہے نہ پرانا دیس،ان کی یہ کہانیاں اس شناختی بحران اور جڑ سے محروم فرد کی کتھائیں ہیں۔

مسعود مفتی نے اس پورے سانحے کو کیونکہ اس وقت وہ سرکاری فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ ہندوستان میں قید بھی رہے۔اس المیے کے حالات ان کے روزنامچے 'لمحے' میں جوں کے توں موجود ہیں۔اس دوران

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

انھوں نے انسان کے رنگ بدلتے رویوں اور دوچہر گی کے عمل کو خود بھگتا۔ اور مغربی پاکستان کے دوغلے چہرے ایک اشتہار چپکا دیا۔ جس کا عنوان ہے 'چہرے مہرے' (27)ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ریزے' در حقیقت ہمارے قومی کردار، نظریاتی بنیادوں اور اور تشخص کے حوالوں کو ریزوں میں ڈھلتے اور گم ہوتے دکھایا ہے۔ مسعود مفتی اخوت و انسانیت کے رشتوں کے بھرم ٹوٹنے کے بھی چشم دید گواہ تھے۔ اس لیے وہ مورخ، صحافی اور ادیب تینوں کا کردار ادا کرتے ہیں، اس کے بارے وہ خود لکھتے ہیں:

"جو حقائق کے متعلق لکھتا ہے، وہ مورخ ہے، جو حقائق کو انسانوں سے ملاتا ہے وہ صحافی ہے اور جو حقائق انسان اور انسانی جذبات کو ملاتا ہے وہ ادیب ہے۔"(28)

ان کے افسانے 'نیند' میں اُس وقت کے ڈھاکہ کا یوں منظر بیان کیا گیا ہے:

"مارچ 1971ء میں ڈھاکہ کیتلی میں بند پانی کی طرح تھا جس کے نیچے دھیمی مگر مسلسل آگ ہو اور ابلنے سے پہلے کی شوں شوں ہو۔"(29)

افسانہ آگے بڑھتا ہے مقامی طلباء کی ٹولی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک پاکستانی طالب علم کے مکان کے باہر نعرے لگانے آجاتی ہے۔ اور اس سے بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جئے بنگلہ کا نعرہ لگائے وہ بالآخر نعرہ لگا دیتا ہے اور پھر اس نعرہ لگانے کی سزا میں اُن فوجیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جو باغیوں کی تلاش میں تھے۔ یوں بنگالی شناخت بھی کام نہ آئی، جسے مجبورا اپنایا گیا تھا۔

مسعود اشعر کے بیشتر افسانے اس انقلاب کی خوں ریزی اور ہجرت و جلا وطنی کے مصائب و مسائل کے عکاس ہیں۔ بشیر منصور کے بقول:

"مسعود اشعر بنیادی طور پر فرد کے ذات کے اندر رونما ہونے والے انتشار اور تضادات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔"(30)

انھوں نے علامتی و استعاراتی اسلوب کے ذریعے قومی سانحات اور تاریخی واقعات کو موضوع بنایا۔ 71ء کی صورتحال پر ان کا افسانہ 'ڈاب اور چیئر مین بو تلیں' اہم ہے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہونے والی دوریوں اور نفرتوں کی نشاندھی کرتا ہے۔ لاؤنج بنگال کی علامت ہے جو آخر کار ڈوبنے لگتی ہے۔ دوسرا افسانہ 'آنکھوں پر دونوں

ہاتھ 'اُن غفلت واغماض برتنے والوں پر چوٹ کی گئی ہے جنھوں نے اٹھتے ہوئے بھنور کے پیش نظر اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیں تھیں۔

'دکھ جو مٹی نے دیئے' یہ اُن بے وطن اور بے زمین افراد کی داستان ہے جو اپنی جگہ چھوڑ کر کئی نسلوں تک بھٹکتے ہیں کوئی بھی مٹی انھیں اپنی شناخت بنانے پر تیار نہیں ہوتی بے وطنی اور مہاجرت کے سیلاب میں بہتے رہتے ہیں۔ان بے شناخت اور بے جڑ افراد کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کا مرکزی کردار شناخت کی خواہش میں مضطرب و بے چین نظر آتا ہے۔چار دہائیاں گزارنے کے باوجود اسے یہ احساس دلایا گیا کہ کوئی بھی دھرتی اس کی شناخت نہیں ہے کیونکہ وہ اس دھرتی کا بیٹا نہیں ہے۔اسے کسی اور مٹی نے جنم دیا ہے۔(31)

"جو کیڑا زمین کے ہم رنگ نہیں ہوتا وہ ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے"

مگر ایسا کیڑا غیر محفوظ ہو تو پناہ کہاں تلاش کرے۔۔۔۔

"اپنی ماں کی گود میں"(32)

ہجرت و جلا وطنی انتظار حسین کے پسندیدہ موضوع ہیں ۔سانحہ مشرقی پاکستان تاریخ کا ایک بہت ہی المناک سانحہ ہے۔اوراس کے حوالے سے بے خبری و غفلت نے اسے اور بھی المیاتی بنا دیا۔اس المیے نے کئی المیوں کو جنم دیا گم ہوتی پہچان، گم ہوتی زمینوں اور رشتوں،ٹوٹی کڑیوں، بچھڑے خاندانوں کے المناک واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔انتظار حسین نے اس تاریخ سے اس بصیرت افروزی سے پردہ اٹھایا ہے کہ آنکھوں کے پردے ہٹتے جاتے ہیں اور کانوں کی کھڑکیاں کھلتی جاتی ہیں انھوں نے تاریخ کے اس اہم موڑ کے حوالے سے متعدد افسانے تحریر کئے مثلاً 'اسیر'،'صبح کے خوش نصیب'،'بے سبب'،'اندھی گلی'،'کشتی'،'نیند'،'وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'،'شہر افسوس'،'وہ جو کھوئے گئے' وغیرہ۔مہاجر لوگ طویل عرصہ مقامی زندگی گزارنے کے باوجود بھی بالآخر شناخت سے محروم کر دیئے گئے۔انھی بے جڑ افراد کا دکھ اور بے بسی کو انتظار حسین نے پیش کیا ہے۔جس کے لیے انھوں نے کربلا کے استعارات و علامات کا سہارا بھی لیا ہے۔

افسانہ 'اسیر'،کے پس منظر میں ہمارے قومی کردار کی پیش کش ہوتی نظر آتی ہے۔ایک تجاہل عارفانہ کا افسوس ناک رویہ ہے ملک کی ساتھ کیا ہو گیا ہے لیکن لاتعلقی اور ذہنی فراریت نے تناؤ کی کیفیت پیدا کی ہوئی ہے۔دو

دوست ایک مشرقی پاکستان اور دوسرا مغربی پاکستان کا ہے، دونوں ہی اس بڑے ایشو سے نظریں چرا رہے ہیں،، ہاں یار گھر میں بیٹھے تو یہی ایک سلسلہ چلتا رہے گا آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ وہی سوال وہی باتیں" یہ نئی اسیری ہے، چلو۔ چلیں،"(33)'وہ جو کھوئے گئے' میں بھی قریبا اسی طرز کی بے خبری اور جان بوجھ کر انجان بننے کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ پہلے کھو جانے والوں کو تلاش کیا جاتا ہے پھر یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے خود کو نہیں گنا شاید۔ آخر کار نام اور شکل بھی بھول جاتے ہیں۔ ویسے ایسے ہی بے خبری ہماری اجتماعی نفسیات کا حصہ بن چکی ہے۔ قومی سانحات پر دو چار دن کا افسوس اور رونا دھونا ہوتا ہے اور پھر وہی بے حسی اور فراموش کر دینے والا قومی رویہ۔ یہی بے حسی 'شہر افسوس' کا حصہ بھی ہے۔ مر جانے والے سوال کا جواب 'زندہ رہنا' ہر بار سوال کرنے والے کی امیدوں پر پانی پھیرتا نظر آتا ہے۔ اس سانحے نے ثابت کی کہ لایعنیت، بے خبری، بے سمتی، بے دردی، بے شناختی اُن افراد کا مقدر ہے جو اپنی زمینوں سے بے دخل کر دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح انسان مرنے کے بعد مردے کی شناخت میں بدل جاتا ہے اسی طرح ایک تارک الوطن، جلا وطن اور مہاجر کی شناخت سے پہچانا جاتا ہے اور اس بے شناختی کا دکھ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ 'اندھی گلی' کا موضوع اس سانحے کا مرکزی نقطہ ہے۔ کہ پہلے 47ء میں لٹ پٹ کر بنگال کو اپنا مسکن بنایا تو 71ء میں انھیں احساس دلایا گیا کہ وہ تو اس زمین کے بیٹے ہیں ہی نہیں، مطلب ہر گلی انھیں اندھی ملی۔ وہ جان گئے کہ ان کی کوئی شناخت نہیں ہے وہ کسی مٹی کے بیٹے نہیں ہیں اور شاید نہ ہی وہ اس قابل رہ گئے ہیں۔ یوں اس سانحے کی تخلیقات اور کرداروں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ جس قدر بے یقینی، بے قدری، عدم قبولیت اور شناخت کا بحران یہاں پیدا ہوا ہے 47ء میں بھی شاید اتنا نہ ہو۔ اس دوہری، تہری ہجرت و جلاوطنی کے دکھ میں فردیت اور شناخت کس طرح شکست و ریخت اور اپنوں کی بے توجہی کا شکار رہی ہو گی اندازا لگانا مشکل نہیں ہے۔

یونس جاوید کے دو افسانے 'کانچ کا پل اور آوازیں'، مشرف احمد کا 'انیس سو اکہتر'، صغیر ادیب کا 'خون پھر خون ہے'، نزہت نوری کا 'پہچانو گھر کون ہے'، نور الہدی شاہ کا 'پکار'، امراؤ طارق کا 'بیس سال بعد'، آصف فرخی کا 'شہر بدری' اور سلمی اعوان کے دو افسانے 'سویتا دیدی' اور 'اُروما'' میں بھی ٹوٹتے رشتوں اور جلاوطنی کے دکھ کا مہابیانیہ ہیں۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

تاریخ بتاتی ہے کہ 1958ء کے پہلے مارشل لا کا زیادہ نہ سہی تھوڑا جواز سول حکومت کی ناکامی کی صورت بہر حال موجود تھا۔اس لیے اُس عہد کی اجتماعی نفسیات نے کوئی زیادہ ردِ عمل نہیں دیا بلکہ بعض صورتوں میں مفید ثابت ہوا۔لیکن دوسرے مارشل لا کی باقاعدہ فضا تیار کی گئی۔یہ دہائی ریاستی شناخت کی دہائی ہو سکتی تھی لیکن خواب پورا نہیں ہوا۔بھٹو جیسے مقبول عام لیڈر کو اندر کر دیا گیا، سر عام کوڑے لگا کر خوف پھیلایا گیا۔متفقہ آئین معطل کر کے نظام مصطفٰی کے نام پر حقوق و آزادی پر شب خون مارا گیا۔جس کے نتیجے میں ادبی دنیا بالخصوص افسانے میں مزاحمتی رویہ بھی اتنی ہی شدت سے پیدا ہوا۔اگرچہ کہ اس سے پہلے ایوب خاں کے عہد میں مزاحمتی رویے علائم و رموز کے ساتھ وقوع پذیر ہو چکے تھے،بقول شہزاد منظر؛

> "اجتماعی ادب کا مقصد کسی خاص بات،ریاستی مظالم،مذہبی تنگ نظری و تشدد اور سیاسی جبر اور معاشی ناانصافی کے خلاف احتجاج کرنا ہے اسی طرح مزاحمتی ادب سے مراد بیرونی تسلط و قومی آزادی کے لیے جدوجہد یا سیسی چیرہ دستیوں کے خلاف شعر و ادب کی تخلیق ہے۔"(34)

۱۹۷۷ کے مارشل لا کو پہلے مارشلاؤں کی نسبت کچھ زیادہ ردعمل ومزاحمت کا سامنا تھا۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ قوم پہلے ہی غیر جمہوری اقدامات اور جمہوری اقدار کی پامالی کے نتیجے میں ملکی سطح پر دولخت ہو چکی تھی۔یہ صدمات ابھی باقی تھے کہ تیسرا ضیائی مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔جس نے ادب کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔علامتوں اور استعاروں میں مزید وسعت و گہرائی اور معنویت پیدا ہوئی،،فرد کی گمشدگی سے بات قومی و علاقائی شناخت تک جا پہنچی۔(35)پابندیوں کے باوجود یہ دور افسانے کے معیار اور تعداد کے حوالے سے زبردست رہا۔رشید امجد لکھتے ہیں:

> "اس ہزیمت نے اس نظریاتی ڈھانچے کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا جو قیام پاکستان کا باعث بنا تھا۔عدم تشخص کا زوال جو پہلے ذات کے تعین کے حوالے سے اٹھ تھ اب قومی سطح پر حل طلب تھا۔"(36)

افسانے میں ہیتی اعتبار سے بھی تبدیلی نظر آنے لگی تھی،سائنسی و صنعتی انقلاب کا اثر افراد کی زندگیاں متاثر کرنے لگا تھا۔جدیدیت کے تحت ادب میں مغربی رجحانات بھی تیزی سے مقبول ہو رہے تھے۔فردیت کی بے مائیگی، گمشدگی

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

اور تنہائی کے احساس کی لہر بلند ہو رہی تھی۔ اعضا کے ٹوٹنے کا احوال ہو یا انفرادی و اجتماعی تشخص کی گمشدگی کا ماتم، سب ہی افسانے میں رقم ہونے لگے:

"آزادیٔ اظہار پر پابندی اور سزاؤں کے خوف کے باوجود ہمارے ادب میں مزاحمتی عمل کسی نہ کسی سطح پر جاری رہا۔"(37)

ضیائی مارشل لا کے ردِ عمل میں ڈاکٹر اعجاز راہی کا مرتب کردہ افسانوی مجموعہ 'گواہی' سامنے آیا جس میں چودہ افسانے شامل تھے۔ یہ سبھی احتجاجی افسانے تھے بقول مرزا حامد بیگ:

"ان افسانوں مارشل لا کی جبریت کے خلاف نفرت کا سمندر موجزن ہے۔"(38)

اس دور کے مزاحمت کاروں میں سے انتظار حسین، احمد داؤد، احمد جاوید، مسعود اشعر، علی حیدر ملک، مرزا حامد بیگ، رشید امجد، یونس جاوید، سمیع آہوجہ، انوار احمد، اور زاہدہ حنا زیادہ اہم ہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ 'خواب اور تقدیر' ریاست اور عوام کے گول دائرے میں گھومنے کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جبر سے نکلنے کا کوئی راستا ہے ہی نہیں۔ جنھیں عوام نجات دہندہ سمجھتے ہیں، نقاب کشائی کے بعد پتا چلتا ہے کہ یہ تو وہی ہے۔ سادہ عوام ہر بار دھوکا کھاتی رہتی ہے:

"نیام سے شمشیر نکال اور کڑک کر کہا کہ اے لوگو تم میں جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آ گیا ہوں۔"(39)

'رات' اور 'کشتی' میں بھی یہی کہانی بیان کی گئی ہے کہ کشتی بھنور میں پھنس چکی ہے کنارہ ملنا محال ہو رہا ہے۔ خشکی ناپید ہے۔ پانی اترنے کی خبر لانے والا بھی کوئی نہیں۔ یہی بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت اُس عہد کی ملکی و سیاسی شناخت تھی۔

مسعود اشعر ساٹھ کی دہائی میں علامتی اور استعاراتی اسلوب کے ساتھ افسانے کی دنیا میں وارد ہوئے۔ عصری سیاسی صورتحال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں فرد اپنی شناخت اور قبولیت و توقیر کا خواہاں ہے لیکن جبریت کے آہنی ہاتھ مضبوط ہیں۔ مصنف نے 'خامشی' کے عنوان سے تین افسانے تخلیق کئے تینوں الگ الگ ہیں لیکن ان کا موضوع 'خامشی' ہے۔ مطلب یہ کہ اُس دورِ آمریت کی مکمل خموشی، جہاں تحریر و تقریر پر پابندیاں ہیں، بات کرنے پر زبان کٹتی ہے۔ بقول شہزاد منظر:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

"ضیا دور میں ادیبوں، صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کو جس طرح برسرعام کوڑے لگائے
گئے اسکی مثال ایوبی دورِ آمریت میں بھی نہیں ملتی۔"(40)

خامشی سیریز کا پہلا افسانہ میاں بیوی کی گفتگو سے شروع ہوتا ہے جو بڑے ایمائی انداز میں ختم ہو جاتا ہے، خامشی2، میں متکلم کو اس کا ایک پرانا ساتھی اپنے گھر بلاتا ہے جب وہ سکوت اور تاریکی میں ڈوبے کمرے میں پہنچتا ہے تو اس کے رویے میں اجنبیت اور سرد مہری بھری ہوئی ہے۔ وہ حیران ہے، راز یوں کھلتا ہے:

"کیا یہ خاموشی شکوک پیدا نہیں کرتی۔۔۔وہ جرح کر رہا ہے۔ مگر پھر وہ مضمون اور
اس پر فرضی نام، کیا مقصد ہے اس کا۔۔۔ تم خود سوچو۔۔ میرے ہاتھوں اگر تمہیں
تکلیف پہنچے تو مجھے کتنا صدمہ ہو گا۔"(41)

یہ فضا دورِ آمریت کی ہے جہاں شک اور غیر یقینی پر پھیلائے ہوئے ہے۔نہ صرف اپنی ذات بے چہرگی اور عدم جسمیت کا شکار ہے بلکہ دوسروں کے عمل سے بھی شکوک و شبہات کے سائے لرزتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا پتا کون اور کب کوئی آمروں کا جاسوس بن جائے۔

آغا سہیل کا افسانہ 'نوشتہ دیوار' ہم کلامی کے انداز میں مارشل لا کے حالات کے جبر کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم بے چین روح ہے اسے کسی پل سکون نہیں:

"سوتے جاگتے مجھے کسی پل قرار نہیں ملتا، اٹھتا ہوں بیٹھتا ہوں ٹہلنے لگتا ہوں آنکھیں
موند لیتا ہوں۔۔۔ گھبرا کر آنکھیں کھول لیتا ہوں، بند آنکھوں کی سوچ کے عذاب سے
بچنے کے لیے میں کیا کیا کرتا ہوں تو اپنی محدود دنیا کے زمان و مکاں میں محبوس ہو جاتا
ہوں۔"(42)

یہ حبس زدہ ماحول تو ضیا عہد کا ہے لیکن اس بارے کوئی بلیغ اشارہ نہیں ملتا۔

احمد جاوید اُس عہد کا معتبر حوالہ ہے جو انسان اور اس کے اندروں کو ہر حوالے سے زندہ در گور کرنے کے درپے تھا۔ لایعنیت، خوف، بے چہرگی، تنہائی اور موت کی گہری کھائیوں میں دھکیلنے کو تیار تھا۔ ان کے افسانے، غیر علامتی کہانی، آثار، گشت پر نکلا ہوا سپاہی، ایسے ہی افسانے ہیں کہ جہاں زندگی اپنی معنویت کے حصول کی جدوجہد میں

ہے۔اور کچھ پا لینے کے خواب میں گزرتی چلی جا رہی ہے۔ان کا اسلوب علامتی اور رمزیت میں گندھا ہوا ہے۔ 'گواہی' میں شامل ان کا افسانہ 'سن تو سہی' ضیاالحق کے فوجی ریاستی جبر کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح استعماری حربے استعمال کر کے عوام کو بے وقوف بنایا۔'غیر علامتی کہانی' میں آمریت کا پوری طرح غلبہ دکھایا گیا ہے۔گلیاں بند ہیں۔سکیورٹی ہائی الرٹ ہے۔بظاہر امن ہے لیکن فراز حالتِ جنگ میں ہیں ہر سو پکڑ دھکڑ، شکوک و شبہات اور خوف کی فضا ہے:

"راتیں طویل ہوتی رہیں دن بڑے ہوتے رہے۔کواڑ بوسیدہ ہو گئے چھت جھک آئی
مٹی برارہ گرنے لگا۔""(43)

افسانہ 'آثار' میں امید کا ستارہ نظر آنے لگتا ہے:

"امید رکھنا چاہیے کہ موسم بدلے گا کہ کچھ آثار بھی ہیں۔"(44)

احمد جاوید کی کتاب 'گمشدہ شہر کی داستان' کے افسانے ہر شے کی گمشدگی کا استعارہ ہیں۔مصنف کی ذات، بیوی، بچے، تعلق داروں، سنسان گلیوں، بے نور چہروں اور سر باہر آنکھوں سے ہوتی ہوئی پورے معاشرے تک پھیل جاتی ہے: "اے لوگو تم نے سنا میں کون ہوں۔۔۔ہاں ہم نے سنا۔۔۔تم لوگوں کا ہجوم ہو۔۔۔لوگوں کا جواب تھا۔۔۔تم بسوں کا دھواں ہو، ہل کی سنی یو، کارخانے کی چمنی ہو۔مہینے کی آخری تاریخ ہو۔۔۔آؤ نعرہ لگائیں کہ ہم سب وہی ہیں جو تم ہو،، کیا جانوں میں کون۔۔۔"اسی خیال کا حامل افسانہ 'میں اور وہ' بھی ہے جو اپنی شناخت کی بجائے اپنے طبقے کی شناخت کرتے ہیں یعنی کہ انسان اور کولہو کے بیل میں کوئی فرق نہیں۔(45)

احمد داؤد کا شاہکار افسانہ 'وہسکی اور پرندے کا گوشت' محافظوں کا طنزیہ بیانیہ ہے۔اس میں مارشل لا کے پورے ماحول کو جس پر مزاحمتی افسانہ نگاروں کی بنیاد تھی، یکجا کر دیا ہے۔پرندے جو آزادی کا سمبل ہیں افسانے کا ہیرو جب سولہویں سترہویں منزل سے پرندوں کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں بھی آزادی کی امنگ پیدا ہوتی ہے:

"پرندے، کیا ہمیں ان جیسی آزادی نہیں مل سکتی؟ دائیں طرف کی بلند و سیع عمارت
کے کونے سے پرندوں کی ایک ڈار نکلی۔

اور اس کے غلام جذبوں کی آس کو جھنجھوڑتی سمندر کے ماتھے پر بنی تلون پر پھیل گئی،،اگر ہمارے پر ہوتے تو۔۔۔۔۔۔؟؟؟"(46)

آزادی اور تشخص کی خواہش بے سروپا نہیں ہے۔بلکہ عین صدائے حق ہے۔صدائے حق جب احتجاج کے شور میں بدل جائے تو ضمیر انسانی کی آواز بن جاتی ہے۔اور پھر یہ صدا صدائے ربانی ہوتی ہے۔آزادی کی فطری خواہش پر قدغن لگانااس عہدِ جبر کا رواج بن چکا تھا۔اس افسانے میں ضیاالحق کے مذہبی کردار پر بھی چوٹ کی گئی ہے۔سچی بات بھی یہی ہے کہ شدت پسندی اور مذہبی انتہاپسندی کے نتیجے میں جو پاکستان نے بھگتاہے اس کی باقاعدہ بنیاد ضیا دور میں ہی رکھی گئی۔امریکا سے اشتراک کرکے طالبان کی نرسریاں بنائی گئیں۔نام نہاد اسلامائزیشن کے چکر میں مذہبی انتہاپسندی کے گروپ تشکیل دیئے گئے جس کی وجہ سے پاکستان میں شناخت کا بحران پیدا ہوااور امنِ عامہ بھی درہم برہم ہوتا رہا۔اور دنیامیں پاکستان کی شناخت دہشت گردوں کی سی بن کر رہ گئی۔جس میں انہی محافظوں اور انہی کے پیدا کردہ طالبانوں کا حصہ ہے۔مذکورہ بالا افسانے میں فرد کی ہر طرح کی آزادیوں کو سلب کر لیناذات اور شناخت کی نفی کے برابر ہے۔بقول اعجاز راہی:

"اس کی کہانیوں کے کردار عہدِ حاضر کی اوپری سطح سے گزر کر ان کی شعور کی گہرائیوں سے ہوتے ہوئے بے بضاعتی کے عہد میں اپنی شناختِ نو کا عمل مکمل کرتے ہیں۔"(47)

رشید امجد کو ایوب کا مارشل لا وراثت میں ملا۔کیونکہ اسی عہد میں انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔جس کا واضح ثبوت 'بے زار آدم کے بیٹے' مجموعہ میں مل جاتا ہے۔جب پختگی کو پہنچے تو دوسرے مارشل لانے آن گھیرا۔جس نے نہ صرف فکر پر بلکہ اسلوب پر بھی اثرات مرتب کیئے۔شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

"رشید امجد نے افسانے کو جن نئی جہتوں سے آشنا کیاان میں سب سے قابلِ ذکر طرزِ اظہار کی ایک شگفتہ پیچیدگی ہے۔"(48)

اس موضوع پر ان کا بہترین افسانہ 'سناٹا بولتا ہے' جو انسانی بے توقیری،بے شناختی،،زباں بندی اور بے یقینی کی مکمل تمثیل ہے۔گٹر کی غلاظتیں اور گندگی اُس دور کی سیاسی اور اجتماعی صورت حال کا بلیغ استعارہ ہیں۔گٹر کی تاریکی میں

ایک بچائی ہوئی تیلی ہی دو بے نام اور بے شناخت کرداروں کی شناخت کی گواہی دے سکتی ہے۔آخر وہ تیلی جلانے کا فیصلہ کرتے ہیں:

> "تیلی بغیر جلے ٹوٹ کر نیچے پانی میں گر جاتی ہے۔سر سراتے اندھیرے اور رینگتے پانی میں ،آنکھیں پھاڑے ہم ایک دوسرے کو دیکھنے شناخت کرنے اور ایک دوسرے کی گواہی دینے کے انتظار میں پتھر ہو جاتے ہیں۔"(49)

جہاں اندھی طاقت سماج کی آپسی شناخت اور پہچان پر غاصب ہو جاتی ہے۔وہیں پر:

> "یہ آداب غلامی بھی ماچس کے بارود کو سیلا کرنے میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔"(50)

اس طرح جبر کا نظام باقی رہتا ہے۔جس کی معاونت ایسے ہی کردار کرتے ہیں۔۔پت جھڑ میں خود کلامی،اور پت جھڑ میں مارے گئے لوگوں کے نام، بھی اسی جہت کا احاطہ کرتے ہیں۔اس موضوع کے حوالے سے دیگر افسانوں میں سے انور سجاد کا 'سیاہ رات'، حامد بیگ کا 'تربیت کا پہلا دن'، مظہر الاسلام کا 'کندھے پر کبوتر'، نعیم آوری کا 'گودھرا کیمپ'، رحم شریف کا 'فیل سوار' اسلم یوسف کا 'ناسفر' اور گوہر سلطانہ عظمی کا 'غلام عورتیں'، منشا یاد کا 'رکی ہوئی آوازیں' اہم ہیں۔

افسانے کی صنف کو رجحانات اور موضوعات کی کمی نہیں رہی۔ہر دور میں عصری رجحانات کا ترجمانی کرتا رہا ہے۔بیسویں صدی کے اوائل میں اس صنف نے اپنی پیدائش کے ساتھ ہی اس عہد کے سیاسی و سماجی اور اقتصادی مسائل کو خود میں سمو کر عوامی احساس و جذبات کی نمائندہ بن گئی۔جدید دور کے دو واقعات ایسے ہیں جنھوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ایک ہیروشیما اور ناگاساگی پر ایٹمی حملہ اور دوسرا 9 ستمبر 2001ء ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر جہاز ٹکرانے کا واقعہ۔جس کا سارا ملبہ مسلمانوں پر لاد دیا گیا اور دہشت گرد کا خطاب دے کر دنیا بھر میں مسلم شناخت کو قابل نفرین اور مشکوک بنا دیا گیا۔جبکہ مسلم نمائندہ کاروں نے اسے جہاد سمجھا اور بم دھاکوں کی صورت میں رد عمل دیا۔بقول آصف فرخی:

> "یہ حادثہ اور اس کے عواقب ہمارے زمانے کی ایک تشکیلی حقیقت defining realityبن گئے ہیں۔۔۔جس نے جنگی جنون اور تاریخ کو بوسیدہ صفحات میں خوابیدہ

تعصبات سے قوت حاصل کی اور جوابی کارروائی وانتقام نے بہت دور ایک چھوٹے سے ملک کو اس طرح نشانہ بنایا کہ پرائے گھر کے شعلوں کی آنچ ہمارے آنگن تک آپہنچی۔"(51)

پاکستان میں نہ صرف آنچ محسوس کی گئی۔ بلکہ پاکستان اس انتقامی کارروائیوں سے براہ راست متاثر بھی ہوا۔ کیوں نہ ہوتا، امریکا کا حلیف جو تھا، جنھوں نے اپنی جنگ ہماری جنگ بنادی اور ہم نے قبول کر کے اپنے ہی عوام کو پرائی جنگ میں مروایا۔ امریکی حمایت کے رد عمل نے وادی سوات سمیت قبائلی علاقوں کو تہس نہس کر دیا۔ ذمہ داری ریاست کی بھی ہے جس نے قرار داد مقاصد کو اپنی شناخت بنایا اور ضیاالحق نے اس پر نہ صرف مہر ثبت بلکہ بنام اسلام اپنے اقدامات سے مذہبی انتہاپسندی کو فروغ بھی دیا۔ جس سے لولے لنگڑے پاکستانی تشخص کو شدید نقصان پہنچا۔ احمد اعجاز لکھتے ہیں:

"نائن الیون کے بعد پاکستانی سماج میں ابہامات ہی ابہامات ہیں۔ چیزیں گڈ مڈ ہو چکیں سوچیں تذبذب زدہ ہیں۔"(52)

ستر کی دہائی کے بعد اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تشخص و شناخت کی صورت گری کی دہائی ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن شومئ قسمت کہ مذکورہ دہائی کے ابتدا میں ہی دہشت گردی کے اس عفریت نے پاکستانیوں کے خوابوں کو اُس وقت ملیامیٹ کر دیا جب 2001 کو صدر بش نے کہا:

"امریکی عوام سوال کرتی ہے کہ ہم پر حملہ کس نے کیا، ہمارا دشمن کون ہے؟"(53)

اس واقعہ کا فوری اثر اُن تارکینِ وطن پر پڑا جو عرصہ دراز سے وہاں رہ رہے تھے۔ اُن کے کردار پر انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ داڑھی رکھنا، نماز پڑھنا، انتہاپسندی اور دہشت گردی کی علامت سمجھا جانے لگا۔ مقامی افراد اور ریاست انھیں جہاز ٹکرانے والوں کا ہم خیال، خیال کرنے لگی۔ اور اُن کی وفاداریوں سے انحراف کیا جانے لگا(54) انتقاماً نوکریوں سے بھی فارغ کر دیا گیا۔ اس سے ان میں بے وطنی اور عدم وتحفظ وبقا کا احساس فزوں تر ہو گیا۔ مذہب اور شناخت کی اہمیت ایکدم بڑھ گئی۔ یورپ و امریکہ میں مدتوں سے بسر ام کرنے والے مسلم کمیونٹی اپنی جڑوں کی سمت مراجعت کرنے لگی۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

اردو افسانے نے اس واقعہ سے جڑے بیشتر پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔اس سے پہلے بھی اردو افسانے نے 70ء کی دہائی میں ذات کے مسائل اور قومی تشخص کے سوال کو اٹھایا۔80ء سے 90ء کی دہائی افغانستان اور سویت یونین کی جنگ کا دور تھا۔اور پاکستان افغانستان کے پیچھے کھڑا تھا۔جہاد و دہشت گردی کے موضوعات نے افسانے میں جگہ بنائی لیکن کوئی معروف مجموعہ سامنے نہیں آ سکا۔90ء سے 2000ء کے دوران افسانے نے نئی جہت اختیار کی اور سیاسی و سماجی صورتحال مشرقی و مغربی تہذیب کا تصادم گلوبلائزیشن،انسانی قدروں کی کایا کلپ، انٹرنیٹ اور میڈیا کی ایجادات جیسے موضوعات در آئے(55)اور پھر اکیسویں صدی کا آغاز ہی بڑے واقعہ سے ہوا جس سے پاکستان/مسلم شناخت معتوب ٹھہری۔فوزیہ اسلم کے بقول؛

"کہا جا سکتا ہے کہ نئے افسانے کا سفر ایک غیر مطمئن آدمی کا سفر تھا،جس کے خواب شکستہ تھے،شخصیت بٹی ہوئی تھی۔پرانی اقدار زنگ آلود تھیں۔"(56)

اس سلسلے کی پہلا افسانہ مسعود مفتی کا'شناخت'ہے جو2002ءمیں شایع ہوا۔خالد مذہبی باغی ہے خاندانی دباؤ سے ٹکرا کر غیر ملکی خاتون'جوزمین'سے شادی کر لیتا ہے۔بچوں کی تربیت بھی مذہبی طور پر آزادانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ سوچ یہی ہے کہ وہ اپنے لیے خود اپنی راہ متعین کریں گے۔پھر اچانک 11/9 کا واقعہ پیش آتا ہے خالد کی شخصیت میں انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔وہ اپنی شناخت کی طرف پلٹتا ہے۔مدتوں کے سوئے ہوئے متروک تشخص کا حامل انسان جاگ جاتا ہے۔جسے اس ملک کے سیکولرازم نے مردہ و فراموش کر دیا تھا۔اچھی بات یہ ہوئی کہ اسی ملک کے اندر ہونے والے واقعے کے بعد بدلتے رویوں نے اُسے بدل دیا۔اب وہ سلیم اور مفیض تینوں مسلمانی کے رشتے میں بندھ گئے۔بقا محفوظ ہو گئی۔یہ قرب مذہب اور قومی شناخت کی طرف پلٹنے کا نتیجہ تھا۔11/9 کا یہ پہلو خاصا مثبت ہے۔جس نے لادینی اور عدم تشخص کے شکار خالد کو اپنی شناخت اور بنیاد سے وابستگی کی ضرورت کا احساس دلایا۔گویا "مسلمان کو مسلمان بنایا طوفانِ مغرب نے"(57)خالد کی تبدیلی اپنی جگہ پاکستان میں عبایا اور اسکارف کا رجحان بڑھا۔مساجد میں نمازی بڑھنے لگے۔نئی نسل میں داڑھی اور مذہبی تعلیم رواج پانے لگی۔دینی اجتماع کو فروغ ہوا۔ذاکر نائیک اور طارق جمیل کی تقاریر ذوق و شوق سے سنی جانے لگیں۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

افتخار نسیم کا افسانہ 'پردیسی' بھی اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔اس کا کردار،اسلم،اپنی شناخت سے محروم ہے۔ کیونکہ وہ 47ء کے فسادات میں ایک لاوارث بچے کے طور پر پالا گیا۔سیدبی بی یہ جاننے میں ناکام رہی کہ بچہ ہندو ہے کہ مسلم، منہ بولے والدین کے مرنے کے بعد اُس کے بڑے بھائی اس کو گھر سے ہی بے دخل کر دیتے ہیں۔وہ پہلے لاہور اور پھر امریکا جابستا ہے۔چالیس سال بسرام کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ تو یہاں بھی پردیسی ہی ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد امریکا نے بھی اُس کے بڑے بھائیوں جیسا سلوک کیا۔آخر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ کس دنیا کا باسی ہے۔وڑلڈ ٹریڈ سنٹر میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں مگر اس کے رنگ اور نسل کے سب لوگوں کو مجرم گردانا جارہا ہے۔اور "ڈانٹا جارہا ہے۔ کہ گو بیک یور کنٹری۔آخر اس کا ملک کونسا ہے۔اس کا وطن کہاں ہے"۔(58)افسانے کا اختتام بے مکانی اور بے شناختی کے کرب کا مجسم اظہار ہے۔ یہ بے زمینی اور بے وطنی ایک ذات کا مسئلہ نہیں رہتی بلکہ تیسری دنیا بھی اسی لپیٹ میں ہے "تھرڈ ورلڈ ایک یتیم خانہ ہے۔ جہاں رہنے والے سب بچے پیدا ہوتے ہی ماں باپ سے بچھڑ گئے تھے"(59)اس سے طاقتور کی سیاست کی نشاندھی بھی ہوتی ہے کہ وہ جب چاہیں بدیسیوں کو بے دخل کر دیں۔

حمید شاہد کا افسانہ 'گانٹھ' بھی اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جس میں برسوں سے سکونت پزیر نیشنلٹی کے حامل پاکستانی ڈاکٹر کو امریکا میں مقامی شناخت کے باوجود شناخت نہیں ملتی۔ڈاکٹر توصیف امریکا کا وفادار ہے اپنی شناخت احساس و خیالات تک کو مقامیت میں ضم کر دیا ہے۔امریکی خاتون سے شادی کی۔بچے کا نام بھی انگریزی میں رکھا، خود اس کے نام کا تلفظ بھی بدل گیا ہے۔ بیس سال اسی بے خبری میں رہا۔اپنے ملک، ثقافت اور زبان کو مڑ کر نہیں دیکھا۔نائن الیون کی ناگہانی آفت نے دیگر ہم وطنوں کی طرح اسے بھی شک و شبے کے چولہے میں جھونک دیا۔ برسوں کی ریاضت بھسم۔ہو گئی۔ بالآخر 'اون کنٹری' میں ڈی پورٹ کر دیا گیا۔رشتے ناتے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ حد یہ کہ اپنا نام اور شناخت کو پس پشت ڈالنے والے کو بیوی بچے ملنے، بلکہ جائیداد ہتھیانے آئے تو وہ بھی اجنبی اور بیگانیت کا شکار تھے۔ڈاکٹر پاکستان آکر اپنی بھولی بسری بہن اور ان کے بچوں سے اپنی رشتہ داری کی تجدید کرتا ہے:

" بادی النظر سے دیکھا جائے تو یہ کہانی بھی علمی ایسے کے تناظر میں لکھی نظر آتی ہے۔اس میں انسانی رشتوں کی شکست وریخت اور تہذیبی وثقافتی قدروں کی پامالی اور نا معتبری کا کاالمیہ دکھائی دے گا۔"(60)

یہ کہانی ظاہر کرتی ہے کہ روشن خیالی اور رنگینی میں اتنا زیادہ نہ ڈوبا جائے کہ انسان کو اپنا کلچر، روایت واقدار ہی بھول جائیں، جو اس کے اجداد کی شناخت ہیں۔

عرفان احمد کی کہانی 'رائیلٹی شو:

"نیو ورلڈ آرڈر مرتب کرنے والوں کا منظر نامہ ہے۔کہ جنھوں نے دنیا کو ایک اسٹیج میں بدل دیا ہے۔جہاں اُن کا ہی حکم اکا چلتا ہے۔۔۔ڈرامہ جاری ہے لیکن ایک دم سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔اداکار و تماشائی سب ہی حیران و ششدر۔۔۔دراصل مابعد نو گیارہ جو خوف، ابہام، شک اور گومگو کی فضا نے جنم لیا تھا یہ کہانی اُسے موثر طریقے سے پیش کرتی ہے۔"(61)

اس سے متعلق نجیبہ عارف کا کہنا ہے کہ یہ کہانی براہ راست گیارہ ستمبر کے واقعے پر تبصرہ ہے۔

زاہدہ حنا کا "کم کم آرام ہے "افغانستان کی اُس تباہی کو پل یان کرتا ہے جو نو گیارہ کے بعد اس ملک میں کی گئی۔کم کم اپنی دادی اماں کو اس تباہی کی روداد لکھ کر بھیجتی ہے:

"میں نے وہ بھی دیکھے جن کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر غائب ہیں۔"(62)

اسی طرز کا افسانہ 'جالے اور دھواں' ڈاکٹر شیر شاہ سید کا ہے۔جس میں کراچی اور نیو یارک کے حالات کا تقابل کیا گیا ہے۔کہ کراچی میں تو لوگ مر رہے ہیں اور نیو یارک جنت ہے:

"یہی لکھا ہوتا کہ کراچی میں جو کچھ ہو رہا اچھا نہیں ہو رہا۔امریکا میں تو ایسا ہو رہا ہے ۔۔۔۔ایسا قانون ہے۔۔۔ایسی خوبصورتی ہے جیسے نیو یارک نہیں کوئی جنت ہو۔"(63)

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

اس واقعے میں اقبال کی موت یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ کہ دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں کہ جو پُرامن ہو اور زندگی چین و آرام سے بسر کی جاسکے۔ 'نائن الیون' بھی ان کا اس موضوع پر اہم افسانہ ہے۔

فرخ ندیم کی کہانی 'چودھویں رات کی سرچ لائٹ' میں بڑی قوتوں پر طنز کیا گیا ہے۔ کہ وہ کس قدر شیر کی طرح کمزوروں پر جھپٹتے ہیں اور کھا پی کر ڈکار بھی نہیں لیتے، یعنی کہ ایک سپر پاور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے دوسروں کے حدود اور اخلاق و قانون کو ایسے پامال کر رہی ہے جیسے جنگل کے خونخوار درندے درندے کمزور کو ہڑپ کرتے ہیں:

> "سانبا کو اپنی طاقت پر غرور ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ گھاس کھانے والوں کا گوشت نہ صرف اس کی ضرورت ہے بلکہ حق بھی۔"(64)

نہتے، بے قصور، اور معصوم عوام کو خودکش بم دھماکوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار کر جنت خریدنے کی خواہش بھی ہمارے یہاں کے نوجوانوں میں پائی گئی۔ یہ اصل میں نام نہاد جہادیوں کا برین واشنگ پروگرام ہے اور نوجوانوں کے مذہبی جذبات بھڑکانے کا عمل ہے۔ اسی سوچ اور عمل کے تناظر میں، منشا یاد کے دو افسانے 'پھندا'، اور 'ایک سائکلوسٹائل وصیت نامہ' ملتے ہیں:

> "تم وہ نڈر، صالح اور شجاع ہو، سمٹ کر پہاڑ جن کی ہیبت سے رائی، لاریب تم پرچم کے کر اٹھو گے تو بحر و بر باطل سے پاک کر دو گے۔"
>
> "تو کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا بچہ جنت کی خواہش کرے۔"(65)

طاہرہ اقبال کا 'یا پروردگار۔۔۔۔'(66) بھی اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے ذرا اس فرق کے ساتھ کہ بعض اوقات معاشی حالات بھی خودکش بمبار بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

افغان امریکا جنگ کی آڑ میں دنا کی بدنام جیلوں میں قیدیوں سے کس طرح کا ظلم و جبر روا رکھا جاتا ہے۔ خالدہ حسین کا 'ابن آدم' اور عاطف سلیم کا 'لاوقت میں ایک منجمند ساعت' اس حوالے سے اہم افسانے ہیں۔ فاروق سرور کا افسانہ 'گنجی چڑیا' بھی ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے۔ جسے محض اس لیے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اٹلی کی پولیس دھر لیتی ہے

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

کہ اس کے فلیٹ کا ساتھی ایک عرب تھا۔اسے اس لیے مار دیا گیا کہ اس نے کمرے میں فلسطینی بچوں کی ٹانک رکھی تھیں۔اب اس کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جارہا ہے:

"(پولیس) مجھے برف پر لٹاتی ہے مجھے سونے نہیں دیتی،اور موچنے سے میرے جسم سے بال اور گوشت نوچتی ہے۔"(67)

نوگیارہ کا عفریت امریکی مسلمانوں کے لیے دوہرے تہرے بے زمینی کے عذاب کی صورت میں نازل ہوا۔روزگار چھننے کے ساتھ ساتھ عدم تحفظ و بے وطنی کا احساس اور پرانی شناخت میں عافیت نعمت لگنے لگی۔ایسی ہی ایک کہانی نیلم احمد بشیر 'جو کوئے یار سے نکلے۔۔۔۔' ہے جس میں ایک مذہبی عورت کی اسلامی شناخت،بے وطنی اور مشکلات کا سبب بنتی ہے۔اس بنا پر شوہر بھی طلاق دے دیتا ہے وہ اسلامک سنٹر چلانے لگتی ہے اور ایک کم عمر مسلم نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔اس دوران یہ واقعہ رونما ہوتا ہے۔اس کے سنٹر پر بھی حملہ ہوتا ہے،"تمہاری بیوی کوئی اسلامک سنٹر چلاتی ہے، ہمیں دیکھنے ہوگا"آخر کار تنگ آکر وہ پاکستان آجاتے ہیں یہاں بھی اس کی شادی پر طعن و ملامت ہوتی ہے۔وہ محسوس کرتی ہے کہ اپنائیت اور پناہ یہاں بھی مفقود ہے۔نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے، کے مصداق صورت حال کا سامنا کرتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ عائشہ سلطانہ، مختصر اردو افسانے کا ساجیاتی مطالعہ،(دہلی: ساقی بک ڈپو،1995ء)،ص69
2۔ انوار احمد،اُردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ،(فیصل آباد: مثال پبلشرز،2010ء)،ص26
3۔ محمد عالم خاں،اردو افسانے میں رومانی رجحانات،(لاہور، علم و عرفان پبلشرز، س۔ن)،ص434
4۔ ظفر سید، تقسیم ہند اور اردو افسانہ،(پٹنہ: کراؤن آفسیٹ سبزی باغ،2000ء)،ص104
5۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں،(لاہور: فکشن ہاؤس، س۔ن)،ص170
6۔ انتظار حسین، پرچھائیں، مشمولہ: آخری آدمی،(لاہور: کتابیات،1967ء)،ص52

7۔ فردوس انور قاضی، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، (لاہور: مکتبہ عالیہ، 1990ء)، ص487

8۔ ظفر سید، تقسیم ہند اور اردو افسانہ، ص106

9۔ گوپال متل، منٹو: شخصیت اور فن، (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، س۔ن)، مرتبہ، ص133

10۔ فردوس انور قاضی، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، ص471

11۔ ظفر سید، تقسیم ہند اور اُردو افسانہ، ص108

12۔ قرۃ العین حیدر، جہاں پھول کھلتے ہیں، مشمولہ: شیشے کے گھر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2008ء)، ص188

13۔ ممتاز شیریں، معیار، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2020ء)، ص171

14۔ شعیب عتیق، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات 1947ء کے اثرات، (ملتان: بیکن بکس، س۔ن)، ص163

15۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، (لاہور: مکتبہ افسانہ خواں، س۔ن)، ص53-54

16۔ شعیب عتیق، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات 1947ء کے اثرات، ص187

17۔ محمد عالم خاں، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، ص546

18۔ اعجاز راہی، تیسری ہجرت، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، س۔ن)، ص28

19۔ فرخندہ لودھی، شباب گھر کے راستے پر، (لاہور: فیروز سنز، 1976ء)، ص184

20۔ انوار احمد، اُردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، ص197

21۔ غلام محمد قاصر، چاند کو چلے پاگل، مشمولہ، لہو لہو قطرہ، (کراچی: نثری دائرہ، 2001ء)، ص134

22۔ غلام محمد قاصر، مشمولہ، ترشا، (کراچی: بکرم پور ہاؤس، س۔ن)، ص135

23۔ سقوط ڈھاکہ اور اردو ادب، مشمولہ: ماہ نو، شمارہ 12، (لاہور: 12)، ص29

24۔ احمد سعدی، درد کا رشتہ، مشمولہ: مٹی کی خوشبو، (ڈھاکہ: شاہکار پبلی کیشنز، 1989ء)، ص122

25۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص368

26۔ شہزاد منظر، تیسرا وطن، مشمولہ: ندیا کہاں ہے تیرا دیس، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، 1990ء)

27۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اُردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص380

28۔ مسعود مفتی، پیش لفظ: ریزے، (لاہور: نقوش پریس، 1978ء)، ص10

29۔ ایضاً، ص140

30۔ بشیر منصور، سقوط ڈھاکہ اور اردو ادب، مشمولہ: ماہ نو، ص27
31۔ زینت افشاں، اردو فکشن: ناول و افسانہ کے سقوط ڈھاکہ پر اثرات، (مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، جی سی فیصل آباد، 2012ء، ص201
32۔ مسعود اشعر، دکھ جو مٹی نے دیئے، مشمولہ: سارے افسانے، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن)، ص367
33۔ انتظار حسین، اسیر، مشمولہ، قصہ کہانیاں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2011ء)، ص39
34۔ شہزاد منظر، مزاحمتی ادب کے خدوخال، مشمولہ: زرنگار، (فیصل آباد: دسمبر 2013ء)، ص52
35۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اُردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص418
36۔ پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات، مشمولہ: پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، (راولپنڈی: گندھارا بکس، 2003ء)، مرتبہ ڈاکٹر نوازش علی، ص35
37۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب، مشمولہ: مزاحمتی ادب، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 1995ء)
38۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 1991ء)، ص136
39۔ انتظار حسین، قصہ کہانیاں، (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2012ء)، ص93
40۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، (کراچی: پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، س۔ن)، ص164
41۔ مسعود اشعر، سارے افسانے، ص137
42۔ آغا سہیل، تل برابر آسمان، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1986ء)، ص70
43۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، (لاہور: خالدین، 1983ء)، ص20
44۔ ایضاً، ص133
45۔ شفیق انجم، اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2008ء)، ص280
46۔ بحوالہ: گواہی، (کراچی، دارالاشاعت، 1978ء)، مرتبہ: اعجاز راہی، ص15
47۔ بحوالہ: اردو افسانے میں علامت نگاری، (راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، 2002ء)، ص301
48۔ حرف شناس و اعترافِ نثر، مشمولہ: روشنائی، رشید امجد نمبر، 2002ء، شمارہ 10
49۔ رشید امجد، سناٹا بولتا ہے، مشمولہ: عام آدمی کا خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، س۔ن)، ص268

50۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اُردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص437

51۔ آصف فرخی، دنیاد نیاد ہشت ہے، مشمولہ: دنیازاد، شمارہ6، (کراچی: شہر زاد، 2002ء)، ص9-10

52۔ احمد اعجاز، پاکستانی ریاست کا نظریاتی سراب، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2021ء)، ص163

53۔ احمد اعجاز، شناخت کا بحران، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2017ء)، ص21

54۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اُردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص627

55۔ محمد ساجد، 11/9 کے اردو افسانے پر اثرات، (لاہور: ندائے گل پبلی کیشنز، س۔ن)، ص35

56۔ اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک، (اسلام آباد: پورب اکادمی، س۔ن)، ص337

57۔ نجیبہ عارف، نوگیارہ اور پاکستانی اردو افسانہ: تحقیق و تجزیہ، (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2011ء)، ص25

58۔ بحوالہ: فنون، (لاہور، شمارہ117)، ص156

59۔ نجیبہ عارف، نوگیارہ اور پاکستانی اردو افسانہ: تحقیق و تجزیہ، ص26

60۔ محمد ساجد، 11/9 کے اردو افسانے پر اثرات، ص40

61۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اُردو افسانہ: سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص639

62۔ بحوالہ: رقص بسمل، (لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 2011ء)، ص154

63۔ بحوالہ، دل ہی تو ہے، (شمراز، کراچی، 2004ء)، ص260

64۔ بحوالہ: نزول۔7، (گوجرہ: ادبی تنظیم جمالِ ادب، 2012ء)، ص66

65۔ بحوالہ: شہرِ افسانہ، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2003ء)، ص350-351

66۔ بحوالہ، گنجی بار، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2008ء)

67۔ بحوالہ، دنیازاد۔13، (شہر زاد، کراچی، مئی 2002ء)، ص89